ڈاکٹر قاضی عابد

ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اردو، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

موجودہ کارپوریٹ کلچر اور منٹو کی تخلیقی دنیا

Dr Qazi Abid

Associate Professor, Department of Urdu, Bahauddin Zakaria University, Multan

Today's corporate culture and Manto's creative world

This article deals with some new questions about post modern world.How the present corporate culture made this world a hell for a common man.Manto passed away much before the corporate culture touched Asian boundries openly. Manto in his short stories portrayed its effects. His short stories and other creative writings like Boo, So candle power ka bulb, Yazid, Chacha sam k nam khatoot and daikh kabira roya may be categorized in this context. In this article these stories have been analyzed.

دنیا بھر کی دانش گاہوں میں تجارتی انصرام کے شعبوں کو کوہ ندا کا درجہ حاصل ہے جہاں دنیا بھر کے ذہین و فطین نوجوانوں کو اس علم کی مبادیات سے لے کر تخصصات کی جزئیات تک اس ملفوف انداز میں پڑھائی جاتی ہیں کہ قدیم منشی گری اور منشی گیری کے اس اتنے ہی پرانے ناپسندیدہ عمل کو دنیا کے مستحسن ترین عمل کے روپ میں پیش کیا جاتا ہے۔کارپوریٹ کلچر کے حوالے سے بھی ان شعبوں میں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے وہ سامراجی مقاصد اور جدید ریموٹ نوآبادیاتی نظام کا مخصوص ملفوف ایجنڈہ ہی ہوتا ہے مگر اجتماعی عقیدے، قدری نظام اور تقریباً الہامی حکم کا درجہ یوں قرار پاتا ہے کہ ہم کسی بھی علم کو اس کے سیاق اور سباق میں دیکھنے کے اہل ہی نہیں رہے۔اشرافی مقاصد کو پورا کرنے میں سامراج کے مقامی دلدل اپنی نفیس خوش لباسی، خوش گفتاری اور خاص وضع کی انگریزی پر عبور اور مخصوص کلامیہ (ڈسکورس) پر اس اطرح عامل ہوتے ہیں کہ وہ ہمارے نئی نسل کو آفاقی مثالی کردار محسوس ہوتے ہیں۔مغربی دنیا میں اس طرح کے خود ساختہ دانشوروں کو پالیسی انٹیلیکچول کہا جاتا ہے یا سرکاری گماشتے جو کارپوریشن اور حکومت کے گٹھ جوڑ کے نتیجے میں عوام کو درپیش مسائل کو حل کرنے کے بجائے اُن کے لیے قابلِ قبول بناتے ہیں۔سامراج اور کارپوریشن کے کاروبار کے فروغ کے لیے کبھی تاریخ کے خاتمے کا اعلان کرتے ہیں اور کبھی تہذیبوں کے تصادم کی بات کر کے دنیا بھر میں جنگِ زرگری کو تیز تر اور طویل تر کرنے کے لیے کتابیں تحریر کرتے ہیں۔اگرچہ اس

سامراجی اور مغربی دنیا میں ایڈورڈ سعید، نوام چومسکی، ایلون ٹوفلر، ڈیوڈ کورٹن اور رابرٹ فسک کی طرح کے دانشور بھی پیدا ہوتے ہیں جو نہ صرف سامراجی دنیا کے عوام کے سامنے کارپوریٹ کلچر، سامراج اور امپیریلزم کا بھانڈہ پھوڑتے ہیں بلکہ صارف دنیا کو بھی انکے لوٹنے کے نئے نئے طریقوں سے باخبر کرتے رہتے ہیں لیکن ہم لوگ جس سماج کا حصہ ہیں وہاں اگر اقبال احمد جیسا کھرا اور آزاد خیال دانشور اور حمزہ علوی، سید جعفر احمد اور مبارک علی جیسے مورخین پیدا ہوں یا وجاہت مسعود اور ڈاکٹر مہدی حسن جیسے دانشور کوئی بات کریں تو ہم پہلا سوال اُن کے عقیدے کی بابت پوچھتے ہیں۔ البتہ اس ساری صورتحال میں تخلیق کار کو ایک استثنیٰ حاصل ہے مگر جس کا فائدہ اس کی موت کے بعد اسے حاصل ہوتا ہے۔ منٹو جیسے تخلیق کار جب خالی بوتل پھینک کر دنیا کو اس کے حسن کا احساس اس قول محال میں دلاتے ہیں کہ تیرا حسن یہی بدصورتی ہے۔

ایلون ٹوفلر نے اپنی معروف ترین کتاب 'تیسری لہر' (Third Wave) میں انسانی سماج کی تاریخ کو تین حصوں میں تقسیم کر کے دیکھنے کی کوشش کی ہے (۱)۔ قدیم قبائلی دور کو وہ پہلی لہر یا زرعی سماج کا پس منظر قرار دیتا ہے۔ دوسری لہر صنعتی سماج کو اپنے ساتھ لائی جسکی تاریخ مختصر اور اثرات شدید، ہمہ رس اور ایک وسیع دنیا تک پھیلاؤ، تیسری لہر مابعد جدید صنعتی سماج کی ہے جسے اہم آسانی سے مابعد جدید دور بھی کہہ سکتے ہیں۔ زرعی سماج سے پہلے کے قبائلی سماج میں انسانی ضروریات اور صرف میں اور فطرت میں پھیلی ہوئی خوراک میں توازن کا رشتہ تھا۔ زرعی سماج سے یہ رشتہ عدم توازن میں ڈھلا اور انسانی ضروریات اور صارفیت کے بالمقابل منڈی، دکان اور بارٹر سسٹم کا تصور ابھرا جو رفتہ رفتہ کرنسی کی شکل اختیار کرتا گیا۔ منڈی کے زیادہ ترقی یافتہ تصور نے انسانی معاشرے میں غلامی، نوآبادیات اور سامراجی عزائم کی بنیاد رکھی، دنیا کے مختلف ممالک میں جان کمپنیوں سے لے کر ایسٹ انڈیا کمپنی، یونائیٹڈ فروٹ کمپنی اور اس قماش کی دیگر کمپنیوں کی تشکیل کی گئی۔ انسانی سماج کی دوسری بڑی تبدیلی جسے صنعتی دنیا کہا جاتا ہے اتنی ہمہ گیر تبدیلیاں اپنے ساتھ لائی کہ پورا معاشرتی ڈھانچہ تبدیل ہوا، مختصر خاندان، تعلیم عامہ اور کارپوریشن اور کارپوریٹ کلچر کا تصور اسی کے ساتھ ابھرا اور نوآبادیاتی عزائم کو بھی ایک نئی شکل وصورت ملی۔ نوآبادیاتی ممالک بیک وقت خام مال کی فراہمی کے ذمہ دار بھی قرار پائے اور ایک بڑی کارپوریٹ منڈی کا کردار بھی نوآبادیاتی دباؤ میں نوآبادیات ہی کو ادا کرنا پڑا۔ اس کا سب سے برا اثر مقامی صنعت وتجارت اور حرفت پر پڑا۔ نوآبادیات کے باشندے بیک وقت محکومی، غلامی اور بے روزگاری کا شکار ہو گئے۔ کارپوریٹ کلچر کا فروغ اٹھارویں صدی سے ہوا اور بیسویں صدی کے وسط تک یہ بام عروج پر پہنچ چکا تھا۔ اب اصل حاکمیت کارپوریشنوں کی ہی تھی۔ جمہوریت نام کی ایک ایسی حکومت تھی جو عوام کے نام پر اور ووٹوں سے تو ضرور تھی لیکن اصل حاکم کارپوریشنوں کے مالک تھے، ملکی قوانین سے لے کر عدلیہ تک سبھی کارپوریٹ سیکٹر کے مطیع وفرمانبردار تھے، ڈیوڈ کورٹن نے اپنی کتاب 'دنیا پر کارپوریشنوں کی حکمرانی' میں لکھا ہے کہ:

> ایک قدامت پسند عدالتی نظام جو ہمیشہ کارپوریٹ وکلاء کی اپیلوں اور دلائل پر کان دھرتا تھا ان پابندیوں اور قدغنوں کو ایک ایک کر کے ختم کرتا گیا جو شہریوں کی جانب سے کارپوریشنوں کے اختیارات پر عائد کی گئی تھیں۔ قدم بہ قدم عدالتی نظام میں نئی نظریں شامل ہوتی گئیں جن کے ذریعے کارپوریشنوں اور کارپوریٹ املاک کا تحفظ دستوری قوانین کا مرکزی نقطہ بن گیا۔ (۲)

لیکن اس سے بڑھ کر ابراہم لنکن کے الفاظ ہیں جسے اس عظیم مصنف نے نقل کیا ہے۔ جو کچھ سامنے آ رہا ہے اسے

دیکھتے ہوئے صدر ابراہم لنکن نے اپنی موت سے ذرا پہلے لکھا تھا:

> کارپوریشنوں کو تخت پر بٹھا دیا گیا ہے۔اس کے بعد اعلیٰ عہدیداروں کا دور آئے گا اور دولت کی طاقت یہ کوشش کرے گی کہ عوام کے تعصبات کو ہوا دے کر اپنے اقتدار کو طول دے......حتیٰ کہ دولت چند ہاتھوں میں جمع ہو جائے گی اور جمہوریہ تباہ ہو جائے گی۔(۳)

یہ بیان اس سرمایہ دارانہ جمہوریہ کے بانی کا ہے (پاکستانی اقبال شناسوں کو جمہوریت پر اقبال کی تنقید کو اس تناظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے) جس کے الفاظ کو جان ایف کینیڈی سے لے کر ریگن اور ریگنسے لے کر سینئر جونیئر بش صاحبان اور اب اوباما کی کوششوں نے سچ ثابت کر دکھایا ہے۔ویت نام سے لے کر افغانستان تک کارپوریشنوں کی حکومت کے اثرات پوری بنی نوع انسان نے برداشت کیے ہیں۔

ٹوفلر کا خیال ہے کہ دنیا مین کارپوریشنوں کا وجود بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی ہوا اس سے پہلے تاجر کمپنیاں ضرور تھیں جو ان کارپوریشنوں کا نقش اول ہیں:

> موج دوم کی آمد سے تقسیم اشیاء کے پیچیدہ اور فرسودہ نظام میں بھی اسی طرح تبدیلی آئی جس طرح پیداوار کے تشہیر شدہ فروغ میں! ریل گاڑیوں، شاہراہوں اور نہروں نے دور دراز واقع مقامات تک رسائی ممکن بنا دی۔صنعت کے فروغ کے نتیجے میں 'تجارتی محل' وجود میں آئے جو موجودہ دور کے اعلیٰ ترین ڈیپارٹمینٹل اسٹور کی ابتدائی شکل وصورت تھی۔پھر پرچون، تھوک، آڑھت اور کارخانوں کے نمائندوں پر مشتمل ایک پیچیدہ نظام وجود میں آیا۔۱۸۷۱ء میں جارج ہننگٹن ، ہارٹ فورڈ نے نیویارک میں اپنا پہلا اسٹور کھولا جس پر شنگرفی رنگ پینٹ کیا تھا اور جس کا خزانچی چینی گوڈے کی شکل کے ایک پنجرے میں بیٹھتا تھا۔ہارٹ فورڈ نے تقسیم اشیاء کے نظام میں اسی طرح جدتیں پیدا کیں جیسی کہ بعد میں ہنری فورڈ نے فیکٹری کے ضمن میں کی تھیں۔اس نے دنیا کی پہلی سپر مارکیٹ دی گریٹ اٹلانٹک اینڈ پیسفک ٹی کمپنی کے نام سے قائم کر کے اس نظام کو ایک نئی بلندی عطا کی۔(۴)

ان کارپوریشنوں نے بیسویں صدی کے نصف اول میں عروج حاصل کیا اور اس صدی کے آخر تک پوری دنیا پر دکھائی نہ دینے والا نیا نوآبادیاتی نظام قائم کر دیا۔عالمی بنک، آئی ایم ایف اور دیگر عالمی تجارتی اور مالی معاہدوں کی گرفت دور دراز کے علاقوں تک پھیل گئی۔دنیا بھر میں جہاں اس کارپوریٹ کلچر کے فروغ کے لیے سرکاری، درباری اور ان کارپوریشنوں کے حلقہ بردار نام نہاد دانشوروں اور قلم کاروں نے اس کلچر کے فروغ اور اسے دنیا بھر کے لوگوں کے پُرکشش بنانے کے لیے متنوع قسم کی تخلیقی اور نیم تخلیقی یا دانشورانہ سرگرمیوں کو فروغ دیا وہیں پر دنیا بھر میں اور خاص طور پر امریکہ میں صاحبِ ضمیر دانشوروں اور تخلیق کاروں نے اپنی پوری دانشورانہ اور تخلیقی سرگرمیوں کو اس نظام کی مزاحمت کے لے وقف کر دیا۔اس سارے عمل کو سمجھنا یوں بھی دشوار ہے کہ پورا کارپوریٹ کلچر ایک نسبتاً رنگین، پرکشش اور دل کو لبھانے والی خوبصورت پیکنگ میں ملفوف تھا اور اپنے عواقب اور مضمرات کو بخوبی چھپائے ہوئے تھا اور جب یہ ویت نام میں موت کا رقص پھیلاتا تھا تو یوں لگتا تھا کہ جیسے یہ امریکہ کی جنگ ہے حالانکہ وہ کارپوریٹ کلچر کی جنگ تھی اس لیے جن دانشوروں نے اس جنگ کی مزاحمت میں قلم

اُٹھایا ہم نے انھیں سیاسی دانشور قرار دیا اور یہ سمجھا کہ دانشور کا کام محض ہماری ایک خاص وضع کی اخلاقی تربیت کرنا ہے حالانکہ یہ دانشور اور ادیب انسانی ضمیر کا اظہار کر رہے تھے اور کارپوریٹ کلچر کی ہوس زر جو نئے گل کھلانے جا رہی تھی اس کے پورے تنوعات کو اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کر رہے تھے۔ منٹو بھی اسی طرح کا ایک تخلیقی ضمیر تھا جو کارپوریٹ کلچر کی خوش شکلی کے پیچھے چھپی ہوئی بدصورتی کو ہمارے سامنے لا رہا تھا۔

سعادت حسن منٹو کی فعال تخلیقی زندگی کا دور بھی وہی ہے جب دنیا پر نظر آنے والی یا بعض اوقات نہ نظر آنے والی کارپوریٹ ثقافت شب خون مار رہی تھی۔ منٹو کی تخلیقی زندگی کا آغاز نوآبادیات سے شدید تخلیقی نفرت سے ہوا۔ ان کا پہلا مجموعہ نوآبادیات کے خلاف تخلیقی ماورا کے تخلیقی غم و غصے کا اظہار یہ ہے۔ 'تماشہ' سے لے کر نیا قانون تک جان کمپنی، ایسٹ انڈیا کمپنی اور ملکہ کی حکومت کے خلاف ایک تخلیقی ردِنوآبادیاتی ردِعمل پھیلا ہوا ہے۔ یہ بھی بنیادی طور پر اس تیزی سے پھیلتے ہوئے کارپوریٹ کلچر کی ایک شکل تھی جسے منٹو نے اپنے تخلیقی عمل کا حصہ بنایا (یاد رہے کہ منٹو کا ادبی گرو وہ باری علیگ تھا جس نے اپنی لازوال کتاب 'کمپنی کی حکومت' میں ہندوستان میں نوآبادیاتی صورتحال کا جائزہ لیا تھا اور دوست وہ خواجہ خورشید انور تھے جو نوآبادیاتی نظام کو بم سے اُڑانے کی خواہش کو بعد میں نغمے میں ڈھالنے پر قادر ہو گئے تھے) یہاں پر منٹو کی تخلیقی کائنات سے کچھ منتخب کر کے ان میں کارپوریٹ کلچر کی اس زمانے کی مروجہ و غیر مروجہ اور دیدہ و نادیدہ شکل و صورت کو شناخت کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

۱۔ بُو (لذتِ سنگ)
۲۔ سو کینڈل پاور کا بلب (سڑک کے کنارے، منٹو راما)
۳۔ یزید (یزید، منٹو نامہ)
۴۔ چچا سام کے نام خطوط (اوپر، نیچے، درمیان)
۵۔ دیکھ کبیرا رویا (نمرود کی خدائی، منٹو کہانیاں)
۶۔ اللہ کا بڑا فضل ہے (اوپر، نیچے، درمیان)

بُو بنیادی طور پر ایک جنسی افسانہ ہے لیکن ہر متن جو تہہ دار ہوتا ہے اور بڑا ہوتا ہے اس کے اندر اپنی تفہیم و توضیح کے متنوع امکانات ہوتے ہیں۔ کارپوریٹ کلچر نے جس طرح فطرت کو نقصان پہنچایا اس کی کئی معروف اور غیر معروف یا دکھائی دینے والی اور دکھائی نہ دینے والی شکلیں ہیں۔ منٹو کے اس متن میں کارپوریٹ ثقافت کا دباؤ انسان سے جنس کی فطری لذت چھین لیتی ہے اور گھاٹن سے فطری ملاپ کی لذت سے سرشار کردار جب شہری غازے کی دلدادہ ڈپٹی کمشنر کی بیٹی سے خلوت میں ملتا ہے تو اسے جس پھیکے پن اور بے کیفی کا سامنا کرنا پڑتا ہے یہ فطرت پر کارپوریشن کے جبر کی نہ دکھائی دینے والی شکل ہے۔

اس کہانی میں تین کردار ہیں، رندھیر، گھاٹن اور بعد کو رندھیر کی بننے والی بیوی۔ رندھیر بمبئی میں اپنی عائلی زندگی کے آغاز سے قبل کچھ جنسی تجربات کا حامل ہے جوان کرسچین چھوکریوں کے ساتھ ہیں جو جنگ سے پہلے چند روپوں کے عوض خوش وقتی کے لیے میسر آ جاتی تھیں مگر جنگ جو خود کارپوریٹ کلچر کے فروغ کی عامل بھی ہے اور معمول بھی، رندھیر کے لیے جنسی رفاقت کے اس پہلو کو معدوم کر دیتی ہے۔ یہ کرسچین چھوکریاں فوج میں بھرتی ہو جاتی ہیں۔ اب رندھیر اور گھاٹن لڑکی جو فطرت

کی طرح بے نام ہے، رندھیر کے سامنے فطرت اور فطرت سے دوری کے فرق کو واضح کرنے کا ذریعے بنتی ہے۔

> سیاہی مائل گندمی رنگ کے نیچے دھندلی روشنی کی ایک تہہ سی تھی جس نے یہ عجیب وغریب چمک پیدا کر دی تھی جو چمک ہونے کے باوجود چمک نہیں تھی۔ اس کے سینے پر چھاتیوں کے یہ ابھار دیئے معلوم ہوتے تھے جو تالاب کے گہرے پانی کے اندر جل رہے ہوں۔(۵)

پھر اس کی خوبصورت بیوی ہے جو ایک مجسٹریٹ کی بیٹی ہے اور شہری تصنع اور ثقافت کی نمائندہ ہے۔ وہ غازے اور لیپا پوتی کی دنیا کا کردار ہے جس نے خود کو کارپوریٹ کلچر کے دباؤ میں دے دیا ہے اور یوں اس سے اس کی لاعلمی میں فطرت کی عطا کردہ چیزیں بھی چھین لی گئی ہیں جن میں کسی آدمی کا بستر پر فطری ساتھی بننا بھی ہے۔

> رندھیر نے آخری کوشش کرتے ہوئے اس لڑکی کے دودھیا جسم پر ہاتھ پھیرا مگر اسے کوئی کپکپاہٹ محسوس نہ ہوئی اس کی نئی نویلی بیوی جو فرسٹ کلاس مجسٹریٹ کی لڑکی تھی اس نے بی اے تک تعلیم پائی تھی۔ اور اپنے کالج میں سینکڑوں لوگوں کے دل کی دھڑکن تھی۔ رندھیر کی نبض تیز نہ کر سکی۔ وہ حنا کی مرتی ہوئی خوشبو میں اس بُو کی جستجو کرتا رہا جو برسات کے انہی دنوں میں جب کہ کھڑکی سے باہر پیپل کے پتے بارش میں نہا رہے تھے اس گھاٹن لڑکی کے میلے جسم سے آتی تھی۔(۶)

'سو کینڈل پاور کا بلب' بھی بظاہر جنس اور بازار کی کہانی ہے لیکن یہ بھی منٹو کے دیگر کئی متون کی طرح متنوع الموضوع کہانی ہے۔ یہ بھی کارپوریٹ کلچر کے اَن دیکھے جبر کو دکھاتی ہے۔ اس کا منظر نامہ بھی 'بُو' کی طرح بمبئی کا ہے جو کارپوریٹ شہر ہے اور کارپوریٹ شہر کی تمام تر قباحتیں اور چیرہ دستیاں اس لوکیل کے اندر موجود ہیں۔ بازار کا دباؤ ہر چیز کو خواہ وہ انسان ہی کیوں نہ ہوں بکاؤ مال بنا دیتا ہے۔ بازار میں کبھی ذہن بکتا ہے اور کبھی جسم اور بیچنے والے کی مرضی اس سودے میں شامل نہیں ہوتی۔ جبر اور قدر کے جن تصورات کی بات ہمارا مذہبی طبقہ کرتا ہے اور پھر انسان کی مجبوری کو اس کا گناہ قرار دے کر جس طرح لائق تعزیر گردانے کی کوشش کرتا ہے اس پر کارپوریٹ کلچر کے تناظر میں ایک بار پھر مکالمے یا سوچ بچار کی ضرورت ہے۔ منڈی یا بازار کے اتار چڑھاؤ اور کارپوریٹ کلچر کے جبر کو منٹو کی اس لکھت کے ان جملوں میں دیکھئے:

> دو برس ہوئے جب وہ ملازمت کے سلسلے میں یہاں آیا تھا تو یہ تانگوں کا اڈہ بہت مشہور جگہ تھی سب سے عمدہ اور سب سے بانکے تانگے صرف یہیں کھڑے رہتے تھے۔ کیونکہ یہاں سے عیاشی کا ہر سامان مہیا ہو جاتا تھا۔ اچھے سے اچھا ریسٹورنٹ اور ہوٹل قریب تھا، بہترین چائے، بہترین کھانا اور دوسرے لوازمات بھی شہر کے جتنے بڑے دلال تھے وہ یہیں سے دستیاب ہوتے تھے۔ اس لیے کہ قیصر باغ پارک میں بڑی بڑی کمپنیوں کے باعث روپیہ اور شراب پانی کی طرح بہتے تھے۔(۷)

جنگ جو کہ کارپوریٹ کلچر کا ایک اہم ہتھیار ہے، کے اثرات کی وجہ سے قیصر پارک بھی اب کاروباری مرکز نہیں رہا اور اب یہ جگہ ایک ایسا منظر پیش کر رہی ہے جو کسی تہذیب یا ثقافت یا اس کے مرکز کے زوال کا ہوتا ہے۔ ایسے میں وہاں ہر طرح کے کاروبار جو اس کلچر نے متعارف کرائے تھے اسی زاول کے سلسلے سے جڑ گئے ہیں۔ وہ خاتون جو اس بازار سے منسلک ہے اسی اجڑے ہوئے ماحول کا اٹوٹ حصہ بن گئی ہے:

اس نے دیکھا کہ ایک چھوٹی سی کوٹھری ہے جس کے فرش پر ایک عورت لیٹی ہے، کمرے میں دو تین برتن ہیں، بس اس کے سوا اور کچھ نہیں، دلال اس عورت کے پاس بیٹھا اس کے پاؤں داب رہا ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد اس نے اس عورت سے کہا" لے اب اُٹھ۔قسم خدا کی ایک دو گھنٹے میں آ جائے گی۔ پھر سو جانا۔"

عورت ایک دم یوں اُٹھی جیسے آگ دکھائی ہوئی چھچھوندر اُٹھتی ہے اور چلائی" اچھا اُٹھتی ہوں۔"(۸)

گاہک کے لیے انتظار اور گاہک کا نہ آنا اور کئی دنوں تک اس کا جاگتے رہنا یہ سب بظاہر تو کارپوریٹ کلچر سے تعلق نہیں رکھتے لیکن یہ اس نحوست بھری ثقافت کا ان دیکھا جبر ہے جو ان لوگوں کے لیے ایسا مہیب بیانیہ ہے جو اس ثقافت کے اندر تحریر کیا گیا ہے۔ بالآخر تنگ آ کر وہ خاتون اپنے دلال کو جو کارپوریٹ کلچر کی کٹھ پتلی ہے مارڈالتی ہے۔افسانے کے واحد متکلم اور دلال کے درمیان اور واحد متکلم راوی اور خاتون کے مکالمے اس پوری صورتحال کو ہمارے سامنے واضح کر دیتے ہیں۔ منڈی، بازار اور اس کی حرکیات جب کارپوریٹ کلچر کے تابع ہوتی ہے تو انسان لاشے میں ڈھل جاتا ہے۔ظالم، ظلم اور مظلوم کی حد بعض اوقات اس طرح گھل مل جاتی ہے کہ حقیقت اور وضع کردہ حقیقت میں امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

'یزید' بھی منٹو کے ایسے افسانوں/ بیانیوں میں شامل ہے جو کارپوریٹ کلچر کی ہوس ناکیوں اور ظلم وستم کو بلیغ اور فنکارانہ انداز میں سامنے لاتے ہیں۔دنیا میں کہیں بھی دریاؤں کے رُخ تبدیل نہیں کیے جاتے اس کے عقب میں جو ماحولیاتی تباہی پوشیدہ ہوتی ہے اور جو انسانی ثقافت میں بنجر پن پیدا ہوتا ہے وہ اس افسانے کا بنیادی سروکار تو نہیں ہے لیکن اس کثیر الجہتی /کثرتِ معنی رکھنے والے متن کی ایک جہت ضرور ہے۔یہ کارپوریٹ کلچر کا دباؤ ہے کہ آپ جغرافیے اور تاریخ کے ساتھ ساتھ ثقافت کو بھی تبدیل کر دیں۔ ہندوستان نے جس طرح سے ایک خاص وضع کی منصوبہ بندی کرتے ہوئے دریاؤں کا رُخ موڑا، اس سے روہی کی وہ ثقافت جو خواجہ غلام فرید کی شعری کائنات میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے، تباہ حالی کا شکار ہو گئی۔زبردست ماحولیاتی بنجر پن پیدا ہوا۔ یہ چیرہ دستیاں کارپوریٹ فارمنگ کی وجہ سے ہوئیں جو کارپوریٹ کلچر کا جزو ہے۔ بیانیے کا مرکزی کردار کوئی پڑھا لکھا فلسفی نہیں وہ کوئی دانشور یا ادیب نہیں ایک عام ان پڑھ شہری ہے لیکن وہ اپنی آنکھوں سے جہان اُمید بساتے ہوئے اپنے بیٹے کا نام یزید رکھتا ہے، اس اُمید پر کہ ایک نے پانی بند کیا تھا یہ پانی کھولے گا۔ وہیں پر وہ عملی ذہانت کا مرقع بھی لگتا ہے جب وہ کہتا ہے کہ گالی دینے سے جذبات کا انخلا ہو جاتا ہے یا جذبات ویسے شدید نہیں رہتے:

جیناں نے کچھ دیر سوچا پھر ہنس کر کہا! موسی کیا تم بھی پاگلوں کی سی باتیں کرتی ہو دریا کون بند کر سکتا ہے وہ بھی کوئی موریاں ہیں۔

بختو نے جیناں کے پیٹ پر ہولے سے مالش کرتے ہوئے کہا: بی بی! مجھے معلوم نہیں۔ جو کچھ میں نے سنا تمہیں بتا دیا۔ یہ بات اب تو اخباروں میں بھی آ گئی ہے۔

کریم داد گھر آیا تو سب سے پہلے جیناں نے اس سے دریاؤں کے متعلق پوچھا اس نے پہلے بات ٹالنی چاہی پر جب جیناں نے کئی بار اپنا سوال دہرایا تو کریم داد نے کہا ہاں کچھ ایسا ہی سنا ہے۔

جیناں نے پوچھا کیا یہی کہ ہندوستان والے ہمارے دریا بند کر دیں گے۔(۹)

منٹو کے اس بیانیے کا راوی/ مرکزی کردار جس تیقن کا حامل ہے وہ دراصل اس کارپوریٹ کلچر کے تبدیل ہونے کی کتھا ہے۔ آج ایلون ٹافلر جس تیسری لہر کی آمد کی بات کر رہا ہے جو کارپوریٹ کلچر کی چیرہ دستیوں کے معتدل کر دے گی اور ایک نیا سماج وجود میں آئے گا جو جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ سماج سے مختلف ہوگا اس کی ایک تخلیقی نوید اس افسانے کے آخری جملوں میں موجود ہے:

> کریم داد نے سنجیدگی سے جواب دیا: ضروری نہیں کہ یہ بھی وہی یزید ہو۔ اس نے دریا کا پانی بند کیا تھا یہ کھولے گا۔(۱۰)

'چچا سام کے نام خط' نو خطوط کا ایک ایسا سلسلہ ہے جسے ایک مضمون کی آٹھ/ نو (۱۱) اقساط کی بجائے ایک مونتاج کی تکنیک میں لکھے گئے بیانیے/ افسانے کے طور پر پڑھا جانا چاہیے جس زمانے میں یہ خط لکھے گئے۔ مغربی دنیا میں کارپوریٹ کلچر کے عروج کا زمانہ تھا۔ اس بیانیے میں کارپوریٹ کلچر کی مختلف الجہات صورتوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ کارپوریٹ کلچر کس طرح سے دو ملکوں میں جنگ کرا کے دونوں کو ہی اپنا اسلحہ بیچتا ہے کس طرح یہ کلچر صارف معاشروں کے رہنے والوں کو مذہبی نعروں میں الجھا کر دنیا بھر میں نہ سوچنے اور انہی نعروں کے اندر الجھے رہنے کی حالت میں زندہ رکھتا ہے۔ پاکستان جیسے ممالک میں ستر اور اسی کی دہائی میں سی آئی اے (جو کارپوریٹ کلچر کا ایک عامل ہے) نے جس طرح مذہبی جنونیوں کی حوصلہ افزائی کی جو بالآخر طالبان کی شکل میں کارپوریٹ کلچر کو اور طرح کی مدد پہنچاتے رہے۔ پھر یہ کہ جس طرح نیو ورلڈ آرڈر کے نام پر پہلے روس کی شکست و ریخت اور دیگر خطوں کے جغرافیے کا از سرِ نو اپنی مرضی سے تعین بھی کارپوریٹ کلچر کا ایجنڈا ہے۔ پاکستان کا دو لخت ہونا اور ۱۹۵۴ء میں منٹو کا اپنی بھتیجی کے حوالے سے ایک جملہ قابلِ غور ہے۔ ان خطوط/ بیانیہ/ افسانہ سے یہ اقتباسات خاصے چشم کشا ہیں:

> ہمارے ساتھ فوجی امداد کا معاہدہ بڑے معرکے کی چیز ہے اس پر قائم رہیے گا۔ ہندوستان کے ساتھ بھی ایسا ہی رشتہ استوار کر لیجیے۔ دونوں کو پرانے ہتھیار بیچیں کیونکہ آپ نے وہ تمام ہتھیار کنڈم کر دیے ہوں گے جو آپ نے پچھلی جنگ میں استعمال کیے تھے۔ آپ کا یہ اسلحہ ٹھکانے لگ جائے اور آپ کے کارخانے بے کار نہیں رہیں گے۔(۱۲)
>
> ہندوستان لاکھ ناپا کرے آپ پاکستان سے فوجی امداد کا معاہدہ ضرور کریں اس لیے کہ آپ کو اس دنیا کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت کے استحکام کی بہت زیادہ فکر ہے اور کیوں نہ ہو اس لیے کہ یہاں کا ملا روس کے کمیونزم کا بہترین توڑ ہے۔ فوجی امداد کا سلسلہ شروع ہو گیا تو سب سے پہلے انہیں مسلح کیجیے گا۔ فوجی امداد کا مطلب جہاں تک میں سمجھتا ہوں ان ملاؤں کو مسلح کرنا ہے۔ میں آپ کا پاکستانی بھتیجا ہوں مگر آپ کی ساری رمزیں سمجھتا ہوں لیکن عقل کی ارزانی آپ ہی کی سیاسیات کی عطا کردہ ہے۔(۱۳)
>
> بھتیجی جو سکول میں پڑھتی ہے کل مجھ سے دنیا کا نقشہ بنانے کو کہہ رہی تھی۔ میں نے اس سے کہا ابھی نہیں پہلے مجھے چچا جان سے بات کر لینے دو۔ ان سے پوچھ لوں کہ کون سا ملک رہے گا کون سا نہیں رہے گا، پھر بنا دوں گا۔(۱۴)

> چچا جان میں نے ایک بڑی تشویش ناک خبر سنی ہے کہ آپ کے یہاں تجارت اور صنعت بڑے نازک دور سے گزر رہی ہے۔ آپ تو ماشااللہ عقل مند ہیں لیکن ایک بیوقوف کی بات بھی سن لیجئے۔ یہ تجارتی اور صنعتی بحران اس لیے پیدا ہوا ہے کہ آپ نے کوریا کی جنگ بندی کر دی ہے۔ یہ بہت بڑی غلطی تھی اب آپ ہی سوچئے کہ آپ کے ٹینکوں، بم بار ہوائی جہازوں اور بندوقوں کی کھپت کہاں ہوگی۔ (۱۵)

'دیکھ کبیرا رویا'، 'اللہ کا بڑا فضل ہے' اور 'شہید ساز' بھی ایسے ہی بیانئے ہیں جو منٹو کی دیگر لکھوں/تحریروں کی طرح کارپوریٹ کلچر کے ان دیکھے جبر کو اپنے تخلیقی تجربے کا حصہ بناتے ہیں۔ منٹو ایک سچا اور کھرا لکھاری تھا وہ کبھی یمینی تو ہو نہیں سکتا تھا لیکن تخلیقی آزادی سے انوٹ محبت نے باری کا چیلا ہونے کے باوجود کبھی یساری آدمی بھی نہیں بننے دیا۔ وہ شاید اُردو کا پہلا اور آخری آزاد تخلیق کار تھا جو اپنے کئی ہم عصروں کی نسبت یوں بھی ممتاز تھا کہ وہ اس زمانے میں کارپوریٹ کلچر کے ان دیکھے استحصال کو اپنا موضوع بنا رہا تھا جب کہ اس کے کئی ہم عصر اسے سمجھنے کی صلاحیت بھی نہیں رکھتے تھے۔

حوالہ جات/حواشی

۱۔ ٹافلر، ایلون، موجِ سوم (مترجم: توحید احمد)، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۹ء
اس کتاب میں مصنف نے پوری انسانی سماجی تاریخ کو تین حصوں میں منقسم کیا ہے لیکن کتاب کو پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ موجِ اول جو کہ زرعی سماج پر مشتمل تھی، اس سے پہلے ایک قبائلی یا خانہ بدوش سماج بھی تاریخ انسانی میں موجود رہا ہے لیکن وہ مصنف کے نزدیک ایک منتشر سماج تھا جس کے کوئی حرکی اُصول اس طرح موجود نہیں تھے جس طرح زرعی سماج، صنعتی سماج اور مابعد صنعتی سماج کے تھے۔

۲۔ ڈیوڈ کورٹن، دنیا پر کارپوریشنوں کی حکمرانی، کراچی، شرکت گاہ، ۲۰۰۴ء، ص ۷۲، ۷۳

۳۔ ایضاً، ص ۷۱

۴۔ موجِ سوم، ص ۴۱

۵۔ منٹو، سعادت حسن، منٹونامہ، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء، ص ۲۴۳

۶۔ ایضاً، ص ۲۴۷، ۲۴۸

۷۔ منٹو، سعادت حسن، منٹوراما، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۰ء، ص ۱۹۷

۸۔ ایضاً، ص ۲۰۱

۹۔ منٹونامہ، ص ۱۰۵

۱۰۔ ایضاً، ص ۱۰۸

۱۱۔ ایک خط صرف ایک سطر پر مشتمل ہے جس میں لکھا گیا ہے:
[یہ میرا اچھا خط تھا، میں نے خود پوسٹ کرایا تھا، حیرت ہے کہاں گم ہوگیا]

۱۲۔ منٹوراما، ص ۳۸۶

۱۳۔ ایضاً، ص ۳۹۳

۱۴۔ ایضاً، ص ۴۰۲

۱۵۔ ایضاً، ص ۴۱۹

مجلسِ مشاورت

~~~~~~

مجلّہ: دریافت (ISSN # 1814-2885) شمارہ: (۱۲) جنوری دو ہزار تیرہ
ناشر: نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد۔ پریس: نمل پرنٹنگ پریس، اسلام آباد
رابطہ: شعبہ اردو، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، ایچ/نائن، اسلام آباد
فون: 051-9257646-50/224,312 ای میل: numl_urdu@yahoo.com
ویب سائٹ: *http://www.numl.edu.pk/daryaft.aspx*
قیمت فی شمارہ: ۳۰۰ روپے۔ بیرون ملک: 5 ڈالر (علاوہ ڈاک خرچ)
~~~~~~

دریافت

شمارہ: ۱۲
(ISSN # 1814-2885)

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

شمارہ : ۱۲

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد